ڈاکٹر راشدہ قاضی*

منٹو کی لسانی تشکیلات۔ تشبیہ کے تناظر میں

Abstract: *Sa'adat Hassan Manto is positively the most celebrated Urdu Novelist. Known for his controversial subjects Manto successfully rendered a social role to the otherwise 'Tabooed' life of sex workers. His work becomes even more illustrious owing to his frequent use of unique similes extracted from the real spheres of human activity. Similes and metaphors serve as necessary ornaments in literature. The value of artistic works is mostly connected with the originality and depth of these devices. Manto has positively taken this art to the new heights of narrative skill. The present study is quite significant as it explores the crafty use of similes by Manto in his heart touching stories.*

تشبیہ اور استعارہ کو "علم بیان" کے باب میں کلام کا زیور تصور کیا جاتا ہے۔ تشبیہ کلام میں ندرت، جدت اور لطافت کا سبب بنتی ہے اور کسی جذبہ، شے یا واقعہ کے اُس مخفی پہلو کو ظاہر کرتی ہے جس کی تہہ تک عام آدمی کی رسائی نہیں ہوتی۔ خوبصورت تشبیہ وہ ہوتی ہے جس میں تکلف، غرابت اور غیر معتدل پہلو موجود نہ ہو۔ تشبیہ کا کلام میں مقام اور مرتبہ یہ ہے کہ اس کے استعمال سے انسان معروف سے مجہول کی جانب سفر کرتا ہے اور ان سچائیوں اور حقائق سے متعارف ہوتا ہے جن کو ظاہر کرنے کے لیے عام انداز اور بیانیہ الفاظ قاصر ہیں۔

بقول شبلی نعمانی:

> "انسان میں فطرتاً یہ بات پیدا کی گئی ہے کہ وہ اشیاء کی تصویر سے لطف اٹھاتا ہے۔ ایک بدصورت حبشی ہمارے سامنے آئے تو ہم کو نفرت ہو گی، لیکن اگر کوئی ہوبہو اس کی تصویر کھینچ دے تو ہم کو لطف آئے گا اور جس قدر وہ اصل کے مطابق ہو گی اسی قدر طبیعت پُر لطف اور استعجاب کا زیادہ اثر ہو گا۔ چونکہ تشبیہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے، اس لیے طبیعت کا اس سے محظوظ اور متلذذ ہونا ایک فطری امر ہے۔" ۲

مراد یہ ہے کہ کامیاب تشبیہ وہ ہے جس میں کسی جذبے، شے یا واقعہ کی ہوبہو تصویر سامنے لائی جائے، اس کے لیے اس پہلو کا ہونا بھی ضروری ہے کہ تشبیہ قریب الفہم اور پُراثر ہو۔ دور از کار تشبیہات کلام کو مشکل، پر تصنع اور الجھاؤ کا شکار کر دیتی ہے، جبکہ سہل، رواں اور عام فہم تشبیہیں کلام کی جان ہوتی ہیں۔ تشبیہ کا تعلق تہذیب و ثقافت اور لسانی و ادبی تاریخ سے بھی بہت گہرا ہے۔ اگر تخلیق کار تشبیہیں اپنی تہذیب و ثقافت، زبان تاریخ، لوک ادب، دینی تصورات اور اپنے خاص سماجی اور تہذیبی ماحول سے اخذ کرتا ہے تو ان کا ابلاغ

* پرنسپل گورنمنٹ کالج آف کامرس برائے خواتین، ڈی جی خان

زیادہ وسیع اور گہرا ہوتا ہے۔ اسی لیے تشبیہ کی اہمیت وافادیت کا ہمیشہ اعتراف کیا جاتا ہے کیونکہ اس کے بغیر کلام ایسے پکوان کی مانند ہوگا جس میں نمک مرچ نہ ہو۔ تشبیہ کا اعتراف مولوی عبدالرحمٰن ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ”شہرستانِ شعر میں اگر تخیل کو دیکھنا اور اس کی حقیقت کو سمجھنا ہو تو ایک دفعہ تخیل کے خیال کو دماغ سے بالکل نکال دیجیے اور صرف تشبیہ کی سیر نگیوں کو دیکھیے اور غور سے سمجھیے، تشبیہ ہی وہ چیز ہے جو شرارہء جذبات کو پرکالہء آتش بناتی، سایہ کو چمکاتی اور نیست کو ہست کر دکھاتی ہے، شعر کا زیور، ادا کا نشتر، اختراع کا منتر؛ کیا بتاؤں کہ کیا کیا تشبیہ کی ذات میں مضمر ہے۔“ ۳

تشبیہ کا یہی کمال ہے کہ قاری اسی جذبے سے متکیف ہوتا ہے جس کی واردات سے تخلیق کار خود گزرتا ہے۔ دراصل فنکار کی نگاہِ دوربین جذبہ کی جس تہہ تک پہنچتی ہے اس تک غیر فنکار انسان عام حالات میں نہیں پہنچ سکتا۔ اسی لیے فنکار ہماری حسیاتی دنیا سے تشبیہات اخذ کرکے لوگوں کو اپنی وارداتِ قلبی میں حصہ دار بناتا ہے اور وہ انھیں اس کیفیت میں لے جانا چاہتا ہے جس جذباتی کیفیت سے وہ خود گزر رہا ہوتا ہے اور یہ کام تشبیہ سے زیادہ اور کس ذریعے سے ہوسکتا ہے؟ اردو شعر وادب آغاز ہی سے فارسی شعریات اور ادبیات سے متاثر رہا ہے۔ اس لیے اردو شاعری میں زیادہ تر تشبیہات فارسی سے ہی ماخوذ ہیں۔ لیکن ہمارے شعراء اور ادباء نے مقامی رنگ میں بھی تشبیہات تخلیق کی ہیں اور ہر عہد میں سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کے زیرِ اثر نئی نئی تشبیہیں بھی جنم لیتی رہی ہیں۔ تشبیہات کا یہ ارتقائی سفر ہمارے شعراء اور ادباء کے علمی، فنی، ادبی اور لسانی شعور کا بین ثبوت ہے۔ عام طور پر تشبیہات کے باب شاعری کو زیادہ تر مرکزِ نگاہ بنایا جاتا ہے اور نثر کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہمیشہ نثری اسالیب قاری کی توجہ حاصل نہیں کرسکتے۔ یہی تشبیہات اور استعارات ہی ہوتے ہیں جن سے شاعر یا نثر نگار کی تخلیقی اداؤں کا پتا چلتا ہے۔ بقول انیس ناگی:

> ”تشبیہ اور استعارہ، شاعری بلکہ عام زبان آوری کی خدوخال ہیں جن کے بغیر انشا پردازی کا جمال قائم نہیں رہتا۔ ایک عامی سے عامی بھی جب جوش یا غیظ و غضب سے لبریز ہو جاتا ہے تو جو کچھ اس کی زبان سے نکلتا ہے وہ استعارات کا قالب بدل کر نکلتا ہے۔ استعارہ دراصل فطری طرزِ ادا ہے۔ جب شاعر یا ادیب تجربے کے اظہار کے لیے موجود ذخیرہء الفاظ اور تراکیب میں اظہار کی صلاحیت نہیں پاتا تو وہ تشبیہ اور استعارے کے ذریعے لسانی مرکبات تیار کرتا ہے۔“ ۴

صرف استعارہ نہیں بلکہ تشبیہ بھی طرزِ ادا ہے۔ جب ان دونوں میں یہ وصف موجود ہو تو ادبی جمال پیدا ہوتا ہے۔ اس تناظر میں سعادت حسن منٹو کے افسانے فطری طرزِ ادا کی ایک لاجواب مثال ہیں۔ اس سلسلے میں وارث علوی لکھتے ہیں:

> ”منٹو نے غیر ضروری تفصیلات، جزئیات، منظر نگاری، فضا بندی، سماجی اور ثقافتی عکاسی سے احتراز کرکے اپنے افسانے کو اس حد تک کفایت شعارانہ بنایا کہ بادی النظر میں بس یہی لگتا کہ وہ تو بس دھان پان قسم کی ایک کہانی کہہ رہا ہے ۔۔۔۔۔ چونکانے والی، سنسنی خیز، استعجاب انگیز اور غیر متوقع انجام کی حامل۔ اگر معاملہ اتنا سیدھا سادہ ہوتا تو منٹو بطور فنکار کے کب کا ختم ہو گیا ہوتا۔“ ۵

چونکا دینے والی صلاحیت اور سنسنی خیزی پھیلانے کی ادا ہی منٹو کو عظیم افسانہ نگار بناتی ہے۔ یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ منٹو سفاک حقیقت نگار ہیں۔ معاشرے میں بکھری سماجی، تہذیبی اور معاشرتی کج رویوں کو اپنے خاص اسلوب اور منتخب لفظیات کی ذریعے اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ طنز کے جملہ پہلو بھی ظاہر ہونے لگتے ہیں اور یہی وہ اسٹائل ہے جو خود بول کر منٹو کی تخلیق کا اعلان کرتا ہے۔ بقول ڈاکٹر انوار احمد:

"اردو کے تمام افسانہ نگاروں میں یہ اعزاز صرف منٹو کو حاصل ہے کہ اس کا اسٹائل پہچانا جاتا ہے۔۔۔ عام طور پر ڈرامائیت، چونکانے کی آرزو اور غیر متوقع انجام منٹو کے اسٹائل کے بنیادی اوصاف قرار دیئے جاتے ہیں جو موپساں اور او ہنری کے اثرات کا کرشمہ بتائے جاتے ہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ منٹو کا بنیادی وصف طنز ہے اس کا جتنا موثر استعمال منٹو نے کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔"[۶]

منٹو کی یہ انفرادیت اس کی فکر اور فن کے اچھوتے پن کی وجہ سے مستحکم ہوئی ہے، اس کا پس منظر یہ ہے کہ منٹو کا عہد تہذیبی شکست و ریخت کا عہد تھا۔ پرانی اقدار پامال ہو رہی تھیں اور ایک نیا دور جنم لے رہا تھا۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی نشاندہی کے لیے منٹو نے اپنا اسٹڈی ایریا "طوائف کا کوٹھا" اور اس سے وابستہ ماحول کو بنایا۔ اس تناظر میں جیلانی کامران نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے:

"منٹو اور ان کے ہم عصر جس زمانے سے تعلق رکھتے تھے وہ برٹش انڈیا کا متحدہ اور مخلوط ہندوستان تھا اور ان کی تربیت جس معاشرے نے کی تھی وہ قدیم مخلوط معاشرہ تھا۔ جہاں مسلمانوں اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے گھرانے ساتھ ساتھ تھے۔ اس زمانے کے مزاج کے مطابق عام فہم معاشرتی رویہ انڈین نیشنلزم کا تھا جسے دیوبند اور مولانا عبدالکلام آزاد نے برابر قبول کر رکھا تھا۔ منٹو کی اوائل جوانی کے دوران جو تحریکیں رونما ہوئی تھیں ان کے خدوخال بھی مخلوط انڈین نیشنلزم سے پیدا ہوئے تھے اور ان کے اسکول کے زمانے میں برصغیر کا آئینی اور دستوری لائحہ عمل اور طریق کار اسی مخلوط انڈین نیشنلزم کے مطابق کرم کا تھا۔ اس بڑے وسیع تر پس منظر میں آزادی کا تصور ظاہر ہوا تھا جسے سیاسی طور پر آل انڈیا لیڈر شپ بروئے کار لانے کے لیے جدوجہد میں مصروف تھی۔ منٹو کی جوانی اور ان کی عملی زندگی کی ابتداء میں آزادی کے تصور نے واضح طور پر معاشرتی مفہوم اور صورت اختیار کی تھی اور معاشرے کے اندر انسان کی آزادی کا موضوع اور مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ ظاہر ہوا تھا۔ منٹو کی کہانیوں کا انداز اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے عورت کی معاشرتی زندگی کو موضوع بناتے ہوئے عورت کے اس مظلوم طبقے کی حمایت میں اپنا فن استعمال کیا ہے جسے قدیم زمانے سے طوائف کہا جاتا ہے۔ منٹو نے نچلے درجے کی طوائفوں میں نسائیت اور اکنامکس کے غیر قدرتی رشتے کی وضاحت کی اور اس امر کی خبر دی کہ

طوائف کے باطن میں عورت کی نسائیت برابر زندہ ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ طوائف کا اخلاقی ضمیر بھی برابر موجود ہے۔ اخلاقی ضمیر کی کارفرمائی کو "کالی شلوار" میں محسوس کیا جاسکتا تھا، جہاں منٹو کالی شلوار، محرم کے تعزیے اور ماتم کے پس منظر کو ایک وحدت فراہم کرتے ہیں۔ اکنا مکس اور انسانی زندگی کا ایسا رشتہ ان سیدھی سادی عورتوں میں بھی دکھائی دیتا ہے جو طوائف کی طرح کہانیوں میں آتی اور گزرتی ہیں اگر ان کہانیوں کی تمام عورتوں کو ایک نظر دیکھا جائے تو ان کے مظلوم ہونے کی کیفیت ہی نمایاں ہوتی ہے۔ یہ عورتیں معاشرہ کے قفس میں سسکتی ہیں اور منٹو ان کی نسائیت کو بیان کرتا ہے۔" ۷

اس طرح کے بیانیے کے لیے منٹو منفرد قسم کی تشبیہات کا استعمال کرتا ہے:

"سلمیٰ نے ایک لمحے کے لیے یہ محسوس کیا کہ اس کی شلوار اور دوپٹہ فرشتوں کے پر بن گئے ہیں ــــــ وہ گھبرا گئی اور جلدی فارغ ہو کر باہر نکل آئی۔ باہر برآمدے میں مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں، سلمیٰ کو ایسا لگا کہ یہ فرشتے ہیں جو بھیس بدل کر آئے ہیں۔" ۸۔

اس افسانے میں سلمیٰ اپنی سہیلی شاہدہ کی باتوں سے خاص کیفیت میں جاکر اپنے اوپر وہ جذبات طاری کر لیتی ہے جن کا اسے پہلے کبھی تجربہ ہوا ہی نہیں تھا شلوار اور دوپٹہ "فرشتوں کے پر" سے اچھوتی تشبیہ سے کسی اور دنیا کی خبر دے رہے ہیں۔ ایک اور تشبیہ دیکھئے:

"سردار، دونوں کی نگاہ بازی کو کچھ اس انداز سے دیکھ رہی تھی جیسے خلیفے اکھاڑے سے باہر بیٹھ کر اپنے پٹھوں کے داؤ پیچ کو دیکھتے ہیں۔" ۹

"زینت نے میری طرف بالکل معصوم کبوتری کی طرح دیکھا۔" ۱۰۔

"بابو گوپی ناتھ" منٹو کے اہم افسانوں میں سے ایک ہے۔ مندرجہ بالا تشبیہات اسی افسانے سے ماخوذ ہیں، اسی طرح کی اور مثالیں بھی اس افسانے سے تلاش کی جاسکتی ہیں۔ لیکن انہی دو کو مدنظر رکھ کر ہم پورے افسانے کے مزاج اور منٹو کی صناعی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وارث علوی نے اس افسانے کے بارے میں کہا تھا:

"بابو گوپی ناتھ" افسانہ نہیں نظم ہے جس کا ہر واقعہ ایک ایسا استعارہ ہے جو ایک جہان معنی لیے ہوئے ہے۔" ۱۱

"ٹھنڈا گوشت" میں منٹو نے تشبیہ کاری کی حد کر دی ہے:

"کلونت کور کا بالائی ہونٹ کپکپانے لگا، ایشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے کلونت کور کی قمیض کا گھیرا پکڑا اور جس طرح بکرے کی کھال اتارتے ہیں اسی طرح اس کو اتار کر ایک طرف رکھ دیا۔" ۱۲۔

"کلونت کور تیز آنچ پر چڑھی ہوئی ہانڈی کی طرح ابلنے لگی۔" ۱۳

"جتنے گُر اور جتنے داؤ اسے یاد تھے، سب کے سب اس نے پٹ جانے والے پہلوان کی طرح استعمال کر دے۔" ۱۴

"ایشر سنگھ نے بڑے دکھ کے ساتھ اثبات میں سر ہلایا، کلونت کور بالکل دیوانی ہوگئی، اس نے لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی، میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا۔" ۱۵

"خون ایشر سنگھ کے گلے سے اڑاڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کور کی طرف شکوے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا: میری جان! تم نے بہت جلدی کی ------ لیکن جو ہوا، ٹھیک ہے۔" ۱۶

یہ افسانہ پیچیدہ، نفسی اور انسان کی انسانیت کی شکست وریخت کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہے، اس میں ایشر سنگھ کے ضمیر کے بوجھ اور کلونت کور کے جنسی جذبے کی ملی جلی کیفیات کو بالکل نئی تشبیہات کے ذریعے سامنے لایا گیا ہے۔

"خوشیا" افسانے کے مرکزی کردار کے اندر کا کرب منٹو کی اس فنی چابکدستی سے عیاں ہے :

"کانتا کی یہ مسکراہٹ ابھی تک خوشیا کے دل و دماغ میں تیر رہی تھی۔ اس وقت بھی کانتا کا ننگا جسم موم کے پتلے کی مانند اس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا اور پگھل پگھل کر اس کے اندر جا رہا تھا۔" ۱۷

"اس وقت بھی وہ کانتا کے ننگے جسم کو دیکھ رہا تھا۔ جو ڈھولکی پر منڈھے ہوئے چمڑے کی طرح تنا ہوا تھا۔ اس کی لڑھکتی ہوئی نگاہوں سے بالکل بے پروا! کئی بار حیرت کے عالم میں بھی اس نے اس کے سانولے سلونے بدن پر ٹوہ لینے والی نگاہیں گاڑی تھیں مگر اس کا ایک رواں تک بھی نہ کپکپایا تھا۔ بس سانولے پتھر کی مورتی کے مانند کھڑی رہی جو احساس سے عاری ہو۔" ۱۸

"خوشیا" کو کانتا کے جس جواب نے سراپا سوال بنا دیا تھا اس میں جو جو کیفیت خوشیا پر سے گزری اور کانتا کا جو "سراپا" اس کے دل و دماغ میں جگہ پا گیا تھا وہ انہی تشبیہوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔

منٹو تشبیہات کے حوالے سے اپنے معاصرین میں جداگانہ حیثیت کے فنکار ہیں۔ اپنے ایک افسانے "انار کلی" کے اختتامیے پر لکھتے ہیں:

"سلیم کو رونے والی لڑکیاں بہت پسند تھیں۔ اس کا یہ فلسفہ تھا کہ عورت رو رہی ہو تو بہت حسین ہو جاتی ہے۔ اس کے آنسو شبنم کے قطروں کے مانند ہوتے ہیں جو مرد کے جذبات کے پھولوں پر ٹپکتے ہیں جن سے ایسی راحت، ایسی فرحت ملتی ہے جو کسی اور وقت نصیب نہیں ہو سکتی ہے۔" ۱۹

منٹو کی یہ فنکاری ہے کہ وہ ہر جذبے، ہر واقعے اور ہر کردار کے مطابق تشبیہات تخلیق کرتے ہیں جس طرح یہاں حسن کی مناسبت سے آنسوؤں کے لیے شبنم کے قطروں کی مثال لے آئے ہیں۔ ایک جگہ نسائی کشش کے لیے لوہے اور مقناطیس کو کس طرح یکجا کیا ہے، مثال دیکھیے :

"وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ ہنستی کھیلتی جارہی تھی۔ محمود اس کے پیچھے چلنے لگا، اس کو اس بات کا قطعاً ہوش نہیں تھا کہ وہ ایک غیر اخلاقی حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے۔ اس نے سیکڑوں مرتبہ جمیلہ کو گھور گھور کے دیکھا۔ اس کے علاوہ ایک دوبار اس کو اپنی آنکھوں سے اشارے بھی کیے۔ مگر جمیلہ نے اسے درخورِ اتمنانہ سمجھا اور اپنی سہیلیوں کے ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ اس کی سہیلیاں بھی کافی خوبصورت تھیں مگر محمود نے اس میں ایک ایسی کشش پائی جو لوہے کے ساتھ مقناطیس کو ہوتی ہے ۔۔۔ وہ اس کے ساتھ چمٹ کے رہ گیا تھا۔" ۲۰

اردو شعر وادب میں مقناطیس اور لوہے کے حوالے سے تشبیہ عام ہے مگر صرتحال میں اس تشبیہ کا آنا اور پھر "چمٹ کے رہ جانا" نئے مفاہم کو جنم دے رہا ہے۔ "آخری سلیوٹ" میں پیش کی گئی تشبیہات موضوع اور عنوان سے کئی مماثلتیں رکھتی ہیں، ملاحظہ کیجیے :

"یہ کشمیر کی لڑائی بھی کچھ عجیب وغریب تھی، صوبیدار ربنواز کا دماغ ایسی بندوق بن گیا تھا جس کا گھوڑا خراب ہو گیا ہو۔" ۲۱

"ربنواز کو وہاں کی پہاڑیوں میں ایک عجیب بات نظر آئی تھی۔ چڑھائی کی طرف کوئی پہاڑی درختوں اور بُوٹوں سے لدی پھندی ہوتی تھی اور اترائی کی طرف گنجی، کشمیری ہتو کے سر کی طرح۔ کسی کی چڑھائی کا حصہ گنجا ہوتا تھا اور اترائی کی طرف درخت ہی درخت ہوتے تھے۔ چیڑ کے لمبے تناور درخت جن کے بٹے ہوئے دھاگے جیسے پتوں پر فوجی بوٹ پھسل پھسل جاتے ہیں۔" ۲۲

"آنکھیں" میں تشبیہات ملاحظہ کیجیے:

"اس کے سارے جسم میں مجھے اس کی آنکھیں بہت پسند تھیں۔ یہ آنکھیں بالکل ایسی ہی تھیں جیسے اندھیری رات میں موٹر کار کی ہیڈلائٹس جن کو آدمی سب سے پہلے دیکھتا ہے۔" ۲۳

"وہاں میں جس آدمی سے بھی ملا، لوہے کے مانند سرد اور بے حس تھا۔" ۲۴

آنکھوں کو موٹر کار کی بتیوں سے تشبیہ اور بے حسی کو لوہے سے تشبیہ خاص طرح کی صورتِ حال کو ظاہر کرتی ہے۔

"اُس کا پتی" میں منفرد مگر دلچسپ تشبیہوں نے شگفتہ صورتِ حال کو جنم دیا ہے :

"لوگ کہتے تھے کہ نتھو کا سر اس لیے گنجا ہوا ہے کہ وہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ اس بیان میں کافی صداقت تھی کیونکہ سوچتے وقت نتھو ہمیشہ سر کھجایا کرتا ہے کیونکہ اس کے بال بہت کھردرے اور خشک ہیں اور تیل نہ ملنے کے باعث بہت خستہ ہو گئے ہیں۔ اس لیے بار بار کھجانے سے اس کے سر کا درمیانی حصہ بالوں سے

بالکل بے نیاز ہو گیا ہے۔ اگر اس کا سر ہر روز دھویا جاتا تو یہ حصہ ضرور چمکتا۔ مگر میل کی زیادتی کی وجہ سے اس کی حالت بالکل اس توے کی سی ہو گئی جس پر روٹیاں پکائی جائیں مگر اسے صاف نہ کیا جائے۔" ۲۵

"جھونپڑے کے چھجے کے نیچے چبوترے پر مادھو اس کا لنگڑا بھائی اور چوہدری بیٹھے تھے۔ ان کے اندازِ نشست سے ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی نہایت ہی اہم بات سوچ رہے ہیں۔ سب کے چہرے کچی اینٹوں کی مانند پیلے تھے، مادھو تو بہت دنوں کا بیمار دکھائی دیتا تھا۔ ایک کونے میں طاقچہ کے نیچے روپا کی ماں بیٹھی تھی۔ غلیظ کپڑوں میں وہ میلے کپڑوں کی ایک گٹھری دکھائی دے رہی تھی۔" ۲۶

"روپا کی ماں طاقچے میں رکھی ہوئی مورتی کی مانند گونگی بنی ہوئی تھی اور چوہدری اپنی مونچھوں کو تاؤ دینا بھول کر زمین پر لکیریں بنا رہا تھا۔" ۲۷

"عورتوں کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ مرد خواہ کتنا ہی بوڑھا ہو جائے مگر اس کو عورت جوان ملنی چاہیے، عورت میں جوانی کو وہ اتنا ہی ضروری خیال کرتا تھا جتنا اپنے ٹینس کھیلنے والے ریکٹ میں بنے ہوئے جال کے اندر تناؤ کو۔" ۲۸

"ستیش چائے پی رہا تھا اور دل ہی دل میں چائے والی کی تعریف کر رہا تھا، بے داغ سفید چینی کی بنی ہوئی تھی۔ ستیش کو داغ پسند نہیں تھے، وہ ہر شے میں ہمواری پسند کرتا تھا۔ صاف بدن عورتوں کو دیکھ کر اکثر کہا کرتا تھا میری نگاہیں اس عورت پر کئی گھنٹے تیرتی رہیں۔۔۔۔ وہ کس قدر ہموار تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل ہو۔" ۲۹

"نھو نے روپا کی طرف دیکھا۔ روپا کی آنکھوں سے آنسو نکل کر سیمنٹ سے لپی ہوئی سیڑھیوں پر ٹپک رہے تھے۔ اس دل پر قطرے پگھلے ہوئے سیسے کی طرح گر رہے تھے۔" ۳۰

گنجے سر کو توے سے، چہرے کو کچی اینٹ سے، بیمار اور لاغر جسم کو میلے کپڑوں سے، عورت کی جوانی کو جال کے تناؤ سے، خوب صورت جسم کو شفاف پانی کی چھوٹی سی جھیل اور مجبور عورت کے آنسوؤں کو پگھلے ہوئے سیسے کے قطروں سے تشبیہ نے مکارپتی کی مکاریوں کو متنوع انداز میں اجاگر کیا ہے۔ سڑک کے کنارے" میں منٹو کا تشبیہاتی اور استعاراتی انداز ہر اعتبار سے قابلِ تحسین ہے۔ یہ انتہائی پیچیدہ، نفسی اور معاشرتی صورتِ حال کا افسانہ ہے اور اہم بات یہ ہے کہ اس کے اظہار کے لیے منٹو نے اپنے روایتی اسلوب سے انحراف کیا ہے۔ اس کی متکلم ایک عورت ہے جو محبوبہ اور پھر ماں ہے لیکن ان دو حیثیتوں پر مقدم اس کا سماجی وجود ہے جو ناجائز بچے کی ماں کا روپ برداشت نہیں کر سکتا۔ افسانے کے اختتام سے پہلے تک کہانی کی زبان کسی حد تک نئے اظہاری منطقے کا سفر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ ۳۱ افسانہ کا آغاز اس کی بہترین مثال ہے:

"یہی دن تھے ۔۔۔۔۔ آسمان اس کی آنکھوں کی طرح ایسا ہی نیلا تھا جیسا کہ آج ہے دھلا ہوا، نتھرا ہوا۔۔۔اور دھوپ بھی ایسی ہی کنکتی تھی ۔۔۔۔ سہانے خوابوں کی طرح مٹی کی باس بھی ایسی ہی تھی جیسی کہ اس وقت میرے دل ودماغ میں رچ رہی تھی ۔۔۔۔۔اور میں نے اسی طرح لیٹے لیٹے اپنی پھڑ پھڑاتی ہوئی روح اس کے حوالے کر دی تھی۔" ۳۲

"میرے سینے کی گولائیوں میں مسجدوں کے محرابوں جیسی تقدیس کیوں آ رہی ہے ؟ نہیں نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ یہ تقدیس کچھ بھی نہیں ۔۔۔۔۔۔۔ میں ان محرابوں کو ڈھا دوں گی ۔۔۔۔۔ میں اپنے اندر تمام چولھے سرد کر دوں گی جن پر بن بلائے مہمان کی خاطر داریاں چڑھی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ میں اپنے خیالات کے تمام رنگ برنگ دھاگے آپس میں الجھا دوں گی۔" ۳۳

"کٹھالی الٹ گئی ہے ۔۔۔۔۔ پگھلا ہوا سونا بہہ رہا ہے ۔۔۔۔۔ گھنٹیاں بج رہی ہیں ۔۔۔۔ وہ آ رہا ہے ۔۔۔۔۔ میری آنکھیں مندر ہی ہیں۔۔۔۔۔ نیلا آسمان گدلا ہو کر نیچے آ رہا ہے۔" ۳۴

"میری باہیں کھل رہی ہیں۔۔ چولھوں پر دودھ ابل رہا ہے۔ میرے سینے کی گولائیاں پیالیاں بن رہی ہیں ۔لاؤ اس گوشت کے لوتھڑے کو میرے دل کے دھنکے ہوئے خون کے نرم نرم گالوں میں لٹا دو۔۔" ۳۵

یہ تشبیہیں ممتا اور ندامت کی ملی جلی کیفیات کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ہیں۔ سینے کی گولائیوں کو مسجد کے محرابوں کی تقدیس سے تشبیہ دینے سے جہاں عورت کا تخلیق کے مقدس عمل سے گزرنے کو واضح کرتا ہے وہیں ان محرابوں کو ڈھا دینے سے متکلم کی ندامت اور اس کے دل پر ضمیر کے بوجھ کی بھی مختلف پرتوں کو سامنے لاتا ہے۔" موسم کی شرارت" میں چند تشبیہیں دیکھیے:

"سڑک کے چاروں طرف چیڑ اور دیودار کے درخت اونچی اونچی پہاڑیوں کے دامن پر کالے فیتے کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔" ۳۶۔

"کچھ فاصلے پر پست قد جھونپڑے تھے جیسے کسی حسین چہرے پر تل۔" ۳۷۔

"وہ جوان تھی، اس گائے کی طرح جوان، جس کے پٹھے جوانی کے جوش سے پھڑک رہے تھے۔" ۳۸۔

"میں ابھی لڑکی کی اس پیاری حرکت کو مزا لینے کی خاطر اپنے ذہن میں دہرانے ہی والا تھا کہ دفعتاً بچھڑا خود بخود اٹھ بھاگا۔ وہ اس تیزی کے ساتھ دوڑ رہا تھا کہ اس کی کمزور ٹانگیں میز کے ڈھیلے پایوں کی طرح لڑکھڑا رہی تھیں۔" ۳۹

"وہ جوان تھی۔ اس کی ناک اس پنسل کی طرح سیدھی اور ستواں تھی۔ جس سے میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اس کی آنکھیں ۔۔۔۔ میں نے اس جیسی آنکھیں بہت کم دیکھی ہیں۔ اس پہاڑی علاقے کی ساری گہرائیاں ان میں سمٹ کر رہ گئی تھیں۔ پلکیں گھنی اور لمبی تھیں۔ جب وہ میرے پاس سے گزر رہی تھی تو دھوپ کی ایک لرزاں شعاع اس کی پلکوں میں الجھ گئی تھی۔" ۴۰

"ہوا تیز تھی۔ گندم کے پکے ہوئے خوشے خر خر کرتی ہوئی بلی کی مونچھوں کی طرح تھرتھرا رہے تھے۔" ۴۱

"دیوالی کے دیئے" ایسا افسانہ ہے جس میں طبقاتی کشاکش کا نقشہ منفرد تشبیہات کے ذریعے کھینچا گیا ہے :

"سرجو کمہار لاٹھی ٹیکتا ہوا آیا اور دم لینے کے لیے ٹھہر گیا۔ بلغم اس کی چھاتی میں سڑکیں کوٹنے والے انجن کی مانند پھر رہا تھا۔ گلے کی رگیں دمے کے دورے کے باعث دھونکنی کی طرح پھولتی تھیں کبھی سکڑ جاتی تھیں۔ اس نے گردن اٹھا کر جگمگ جگمگ کرتے دیوں کی طرف اپنی دھندلی آنکھوں سے دیکھا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ دور۔۔۔۔۔۔ بہت دور۔۔۔۔ بہت سے بچے قطار باندھے کھیل کود میں مصروف ہیں۔ سرجو کمہار کی لاٹھی منوں بھاری ہو گئی۔ بلغم تھوک کر وہ پھر چیونٹی کی چال لگا۔" ۴۲

"پھر ایک مزدور آیا پھٹے ہوئے گریبان میں سے اس کی چھاتی کے بال برباد گھونسلوں کی تیلیوں کے مانند بکھر رہے تھے۔ دیؤں کی قطار کی طرف سے اس نے سر اٹھا کر دیکھا اور اسے ایسا محسوس ہوا کہ آسمان کی گدلی پیشانی پر پسینے کے موٹے موٹے قطرے چمک رہے ہیں۔ پھر اسے اپنے گھر کے اندھیارے کا خیال اور وہ ان تھرکتے ہوئے شعلوں کی روشنی کنکھیوں سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔" ۴۳

اس طرح کی بے شمار تشبیہات ہیں جن سے منٹو کے افسانے مزین ہیں۔ وہ ایسی تشبیہات کیوں استعمال کرتے ہیں؟ اس کا جواب منٹو خود کرتے ہیں :

"لوگ مجھے سیاہ قلم کہتے ہیں لیکن میں تختہ سیاہ پر کالی چاک سے نہیں لکھتا، سفید چاک استعمال کرتا ہوں تاکہ تختہ کی سیاہی اور بھی نمایاں ہو جائے۔" ۴۴

منٹو کے اس قول سے بات واضح ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی کہانی بیان کرنے کے لیے اس طرح کے عنوانات، کرداروں کے نام، لفظیات، استعارات اور تشبیہات استعمال کرتے ہیں کہ ایک ہی جست میں قاری اسی ماحول میں پہنچ جاتا ہے جس ماحول سے کرداروں اور کہانی کا تعلق ہوتا ہے۔ اس طرح کے تجربے اردو فکشن میں کسی اور کہانی کار کے ہاں نہیں دکھائی دیتے۔ دور از کار تشبیہات فن کار اور قاری کے درمیان ابلاغ کے کئی مسائل پیدا کر دیتی ہیں۔ منٹو اپنے خیال کے لیے بڑی سہولت سے وہی فنی پیرایہ سامنے لاتا ہے جو اس خیال سے مکمل مناسبت رکھتا ہے۔ اس سے ان کی کہانی کا ابلاغ بڑھ جاتا ہے۔ تخلیقی ادب میں تشبیہ کی غرض اور غایت یہ ہوتی ہے کہ قاری کو ان جذبات اور احساسات تک پہنچایا جائے جو عام الفاظ میں ممکن نہیں ہوتا یعنی معروف سے مجہول کے سفر کے لیے تشبیہ سے بہتر اور کوئی راستہ نہیں۔45 منٹو کا یہی کمال ہے کہ اس نے اپنے افسانے اور اس کے کرداروں کے سماجی، مذہبی اور معاشی حیثیت اور ان کے ماحول کے مطابق تشبیہات تراشیں اور ان عام فہم چیزوں سے تشبیہیں دیں جو بالکل سامنے کی تھیں، شاید کوئی اور فنکار ان چیزوں کو تشبیہ کے قابل بھی نہ سمجھتا جنھیں مد نظر رکھ کر منٹو نے اپنی کہانیوں کا سفر جاری رکھا اور ان عام اور ردی ہوئی چیزوں کو نئے مفاہم دے کر اردو افسانے کو ترو تازہ اسالیب سے متعارف کرایا۔ منٹو کے کردار سماج کے دھتکارے ہوئے کردار ہیں۔ اس لیے ان کرداروں کے لیے پھولوں جیسی لطیف تشبیہیں مستعمل نہیں ہو سکتی تھیں، کباڑ، کچرے کے ڈھیر، طوائف کے کوٹھے کی بدبودار اشیاء اور مایوس ماحول اور محنت کش کے

ٹوٹے پھوٹے اوزار اس کے الجھے ہوئے بال اور خون اور بلغم سے لتھڑی زبان سے جو تشبیہیں تشکیل پا سکتی تھیں منٹو نے وہی تشبیہیں تخلیق کر کے اردو زبان میں منفرد احساس کو پیدا کیا ہے، یہی منٹو ہے۔

حوالہ جات:

۱۔ شوکت سبزواری، معیار ادب (کراچی: مکتبہ واسلوب، 1961ء)ص95

۲۔ شبلی نعمانی، موازنہ انیس ودبیر (لاہور: عشرت پبلشنگ ہاؤس، س ن) ص 51-52

۳۔ عبد الرحمٰن، مولانا، شمس العلماء مراۃ الشعر (لاہور: کتاب خانہ نورس1950ء)ص 191

۴۔ انیس ناگی، تنقید شعر (لاہور: میری لائبریری،1968ء)ص 101

۵۔ وارث علوی، منٹو ایک مطالعہ (نئی دہلی: وجے پبلشرز،1997ء)ص 21

۶۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ۔۔۔ ایک صدی کا قصہ (فیصل آباد: مثال پبلشرز،2010ء)ص267

۷۔ جیلانی کامران: منٹو اور تحریک آزادی، مشمولہ مضمون، کتابی سلسلہ نمبر1 ''عبارت ''ڈاکٹر نوازش علی، مرتب:(راولپنڈی: گلنار کالونی، 1997ء)ص234

۸۔ سعادت حسن منٹو، منٹو افسانے، جلد اول، تحقیق و تدوین: ڈاکٹر ہمایوں اشرف:(لاہور: نگارشات پبلشرز،2007ء)ص316

۹۔ ایضاً، ص200 ۱۰۔ ایضاً، ص206 ۱۱۔ ایضاً، ص164 ۱۲۔ ایضاً، ص598

۱۳۔ سعادت حسن منٹو، منٹو افسانے، جلد اول، تحقیق و تدوین: ڈاکٹر ہمایوں اشرف:(لاہور: نگارشات پبلشرز،2007ء)، ص598

۱۴۔ ایضاً، ص598 ۱۵۔ ایضاً، ص599 ۱۶۔ ایضاً، ص599

۱۷۔ سعادت حسن منٹو، منٹو افسانے، جلد اول، تحقیق و تدوین: ڈاکٹر ہمایوں اشرف:(لاہور: نگارشات پبلشرز،2007ء) ص845

۱۸۔ ایضاً، ص846 ۱۹۔ ایضاً، ص126 ۲۰۔ ایضاً، ص30

۲۱۔ سعادت حسن منٹو، منٹو افسانے، جلد اول، تحقیق و تدوین: ڈاکٹر ہمایوں اشرف:(لاہور: نگارشات پبلشرز،2007ء)، ص21

۲۲۔ ایضاً، ص21 ۲۳۔ ایضاً، ص49 ۲۴۔ ایضاً، ص49

۲۵۔ ایضاً، ص78 ۲۶۔ ایضاً، ص79 ۲۷۔ ایضاً، ص79 ۲۸۔ ایضاً، ص87

۲۹۔ سعادت حسن منٹو، منٹو افسانے، جلد اول، تحقیق و تدوین: ڈاکٹر ہمایوں اشرف:(لاہور: نگارشات پبلشرز،2007ء) ص87

۳۰۔ ایضاً، ص90 ۳۱۔ انوار احمد، ڈاکٹر، اردو افسانہ۔۔۔۔ ایک صدی کا قصہ۔ ص266

۳۲۔ سعادت حسن منٹو، منٹو افسانے، جلد دوم، ص68 ۳۳۔ ایضاً، ص 71 ۳۴۔ ایضاً، ص 71

۳۵۔ ایضاً، ص72 ۳۶۔ ایضاً، ص779 ۳۷۔ ایضاً، ص779 ۳۸۔ ایضاً، ص780

۳۹۔ ایضاً، ص781 ۴۰۔ ایضاً، ص782 ۴۱۔ ایضاً، ص784 ۴۲۔ ایضاً، ص905

۴۳۔ ایضاً، ص905

۴۴۔ سعادت حسن منٹو، منٹو افسانے، جلد اول، ص55

۴۵۔ مزمل حسین، ڈاکٹر، اردو میں علم بیان اور علم بدیع کے مباحث (لاہور: مجلس ترقی ادب،2010ء)ص99